محمد طفیل سالک

امام شعرانی کا نظریۂ عبدِ کامل

قطبِ ربانی، غوثِ صمدانی حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ[۱] اپنے دَور میں تصوف کے امام گزرے ہیں۔ انھوں نے تصوف وسلوک کے اہلِ علم طبقہ سے متعارف کرانے میں گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ تھا اور وہی اپنے دَور میں اس کارنامے کو سرانجام دینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھے۔ کیونکہ وہ صرف صوفی ہی نہ تھے بلکہ ایک بہت بڑے عالم اور مجتہد فقیہ بھی تھے۔ انھوں نے تصوف وسلوک کے علاوہ فقہ، تفسیر، کلام، عقائد، سیر وسوانح، شعر وادب، قواعد اور روزمرہ طب کے ایسے متنوع موضوعات پر متعدد یکتائے روزگار تحقیقات پیش کی ہیں۔ قاری حیران ہوتا ہے کہ کس طرح بظاہر متضاد علوم ان کی ذاتِ مجمع الصفات میں جمع ہو گئے۔

---

[۱] امام ابوالمواہب عبدالوہاب بن احمد بن علی الشافعی الشاذلی الشعرانی، ۲۷ رمضان المبارک ۸۹۸ھ کو قلقشندہ، جو دریائے نیل کے ڈیلٹا میں واقع ہے اور امام کی والدہ کا آبائی گاؤں تھا، میں پیدا ہوئے اور ۱۲ جمادی الاولی ۹۷۳ھ میں قاہرہ میں وصال فرمایا۔ ساقیہ ابی شعرہ آپ کا آبائی گاؤں تھا، اسی نسبت سے آپ شعرانی یا شعراوی کہلاتے ہیں۔ امام شعرانی نے شیخ علی الشونی، علامہ جلال الدین سیوطی، شیخ ناصر الدین اللقانی اور شیخ احمد البدوی اور شیخ السمنودی ایسے اساطین علم سے استفادۂ علمی کیا اور سیدی علی الخواص، سیدی ابراہیم المتبولی، شیخ علی المرصفی اور شیخ الاسلام زکریا الانصاری ایسے مشائخ کرام سے تربیتِ باطن اور خرقۂ طریقت حاصل کیا۔ حضرت ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ کی تصانیف میں انوار القدسیہ فی آداب العبودیۃ، تنبیہ المغترین، کشف الحجاب والران عن اسئلۃ الجان، لطائف المنن، الطبقات الکبریٰ، لواقح الانوار، سواطع الانوار، القول المبین، الکبریت الاحمر نے خاص مقبولیت حاصل کی۔ اگرچہ حضرت نے تمام رائج الوقت صوفیانہ سلسلوں سے استفادہ کیا تھا لیکن بنیادی تعلق سلسلہ شاذلیہ سے تھا جس کے بانی حضرت ابوالحسن شاذلی ہوئے ہیں۔ اسی لیے آپ کو شاذلی بھی کہا جاتا ہے۔

صوفیا کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ علم ظاہری (شرعی) سے کورے ہوتے ہیں یا اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے اور ان کا طریق (طریقت و سلوک) شریعت غرا کے مخالف اور متضاد ہوتا ہے ۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جس کے بعض علما شکار ہیں۔ حضرت امام شعرانیؒ نے علمائے ظاہر کے اس الزام کی خوب قلعی کھول دی ہے ۔ وہ اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ صوفیہ کا طریق ، اسلام سے الگ ہے، یا صوفیہ علوم ظاہرہ شرعیہ فقہ و حدیث کے مخالف ہیں ۔ ان کے نزدیک کتاب و سنت ہی اصل سرچشمۂ علم و حکمت ہے جس سے استفادہ کیے بغیر راہ تصوف میں قدم رکھنا خطرات کو دعوت دینا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"سالک کو چاہیے کہ وہ قرآن و حدیث وغیرہ علوم ظاہریہ شرعیہ سے پورا پورا واقف ہو ۔ اس کے بعد چاہیے کہ وہ اس راستے میں قدم رکھے، ورنہ اس کو زندیق و مبتدع ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوگا، کیونکہ سالک پر اس راستے میں ایسے امور تکوینی منکشف ہوتے ہیں جو کہ ضابطۂ شریعت کے بظاہر موافق نہیں ہوتے جس سے سالک کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ . . . . . . بات دراصل یہ ہے کہ فقر کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہے ۔ اس راہ میں ہزاروں جگہ مہیب گھاٹیاں اور خوفناک صحرا و پہاڑ ہوتے ہیں جو بغیر رہبر کے طے نہیں ہو سکتے ۔ رہبر نور شریعت ہوتا ہے لیکن اس نور سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جسے نور باطن بھی حاصل ہو۔"[۵۲]

مختصر یہ کہ امام شعرانی شریعت و طریقت کو متخالف و متناقض خیال کرنے کے بجائے لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صوفیہ کا طریق کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اور جو اس کے برعکس عمل کرتا ہے وہ راہ راست سے بہت دور ہے ۔ نیز جو شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس سے تکالیف شرعیہ ساقط ہیں اور کوئی دلیل اس کے دعوے کی تصدیق پر قائم نہیں ہوتی تو وہ شخص یقیناً کاذب اور قابل گرفت ہے ۔ تاہم ان کا نظریہ یہ ہے کہ کتاب و سنت سے صحیح استفادہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کسی مرد کامل کی صحبت و تربیت میسر ہو اور دل کی دنیا آباد ہو:

تیرے دل پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

---

[۵۲] انوار القدسیہ فی آداب العبودیہ باب سوم ۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امام شعرانی لکھتے ہیں :

"اگرچہ الفاظِ منزلہ شرعیہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لیکن ان علوم کی حقیقت شناسی اور معارف و دقائق کے اخذ و ادراک کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ حقائقِ قرآنی وقتاً فوقتاً کامل عارفوں کے دل پہ نازل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا تاکہ ہر زمانے میں ان کے ذریعے صاحبِ استعداد حضرات کو فائدہ پہنچتا رہے۔"[۵۳]

تاہم ان کے نزدیک یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ولی کی دعوت ذاتی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کی دعوت، رسول کی دعوت کے تابع ہوتی ہے۔ وہ رسول کی زبان سے دعوت دیتا ہے نہ کہ اپنی زبان سے۔ لہٰذا اگر کوئی مدعیِ ولایت، رسول کے حکم کی مخالفت کرے تو اس کی اطاعت جائز نہیں خواہ وہ ہوا ہی میں اُڑ کر کیوں نہ آئے اور اگر کوئی ایسا کرے تو سمجھنا چاہیے کہ اسے علم الیقین حاصل نہیں ہوا اور اسے وہ بصیرت و معرفت جو شرائطِ ولایت سے ہے، نصیب نہیں ہوئی۔ علامہ شعرانی کے افکار یقیناً قابلِ داد ہیں اور اُن سے ہمارے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ شریعت اور طریقت ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور انھیں ضدین قرار دے کر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا:

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

الانوار القدسیہ

انوار القدسیہ فی آداب العبودیہ۔ امام عبدالوہاب شعرانی کے اہم اور مقبول ترین رسائل تصوف میں سے ہے جو تین ابواب اور ایک خاتمہ پہ مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے عبودیت کے مقام اور عبدِ کامل کے صوفیانہ تصور پہ بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تصوفِ اسلامی ہم سے کس قسم کی زندگی بسر کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کے جو بلند پایہ نمونے اور جو متواضع اور خلیق شخصیتیں تصوف کے گہواروں میں پیدا ہوئیں، انہی کے دم قدم سے چمنِ اسلام میں بہار کا سماں قائم رہا اور اغیار کی مسلسل

---

۵۳ انوار القدسیہ فی آداب العبودیہ۔ مقدمہ

سازشوں کے علی الرغم اسلام برابر بڑھتا، پھیلتا، پھولتا اور ترقی کرتا رہا۔

زیر مطالعہ کتاب میں عبودیت، طلب علم نافع، فقر و ولایت کے آداب و لوازم اور ان وساوس شیطان اور خدشات نفس کا بیان کیا گیا ہے جو سالک کو راہ سلوک میں اور طالب علم کو طریق طلب میں اور عابد کو راہ عبودیت میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے سالکین کے حالات بھی درج ہیں جو مقام عبودیت سے گرے ہوتے ہوتے ہیں۔ امام شعرانی فرماتے ہیں کہ جو فقیر صاحب صدق، طالب عرفان اس کا مطالعہ کرے گا، اسے عبودیت کے آداب اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سے کافی آگاہی ہو جائے گی کیونکہ اس میں مشیخت و بزرگی کے غرور کو توڑا گیا ہے اور ریا و تکبر کی قلعی کھولی گئی ہے جو اکثر طالبوں کو اس راستہ میں دامن گیر ہوتا ہے، جو شیخ اپنی بزرگی جتلاتا ہے اور اخلاق رذیلہ سے اس کا باطن صاف نہیں ہوتا، اس کے حق میں یہ الفاظ عارفانہ زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ انبیائے کرام و عارفین کاملین کے علاوہ اپنے ہم جنسوں میں امتیاز و عزت کے طالب ہوتے ہیں وہ جھوٹے مدعی اور کوچۂ معرفت سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں۔

الواقح قدسیہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے امام شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کے احوال و مقامات اور سالکین طریقت کے مدارج کے بارے میں سرگرداں تھے۔ کہ ایک دن جبکہ پیر کا روز اور رجب ۹۳۱ھ کی سترھویں تاریخ تھی اور وہ مصر کے قریب فسطاط کے مقام پر ایک روضہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ ان پر اچانک حالت جذب طاری ہوئی اور انھوں نے ہاتف کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عبودیت کے آگے اولیا کے تمام مراتب و مقامات ہیچ ہیں۔ اس کے بعد انھیں عبودیت کی حقیقت اور اس کے آداب و متعلقات دریافت کرنے کی جستجو ہوئی جس کا نتیجہ یہ کتاب ہے اور یہ ان خیالات پر مبنی ہے جو ان پر الہامی صورت میں وارد ہوئے۔ ان سے پہلے کسی نے عبودیت کے مقام پر اتنی کھل کر گفتگو نہیں کی۔

زیر نظر مقالہ اسی کتاب مستطاب کا لب لباب ہے۔ ہم نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ کوئی بات علامہ شعرانی کی منشا کے خلاف نہ کہی جائے اور رعایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے ہم نے انہی کے الفاظ و تراکیب پر انحصار کیا ہے۔ عبودیت کے بارے میں ان کے یہ الہامی تاثرات

غور سے پڑھنے کے قابل ہیں کیونکہ ان سے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے اور کئی مشکل مسائل اور مہماتِ تصوف کا حل ملتا ہے۔ بالخصوص سالک کے لیے تو ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ ایک ایسے صاحبِ حال و دل کے قلم عرفان رقم سے حقیقت و معرفت کے اسرار و رموز سے آگہی پاتا ہے، جو خود عرفان و سلوک الی اللہ کی آخری منزل پر جلوہ افروز ہے۔ ذوقِ معرفت سے محروم اگر تصوف و سلوک کے کسی مسئلہ پر قلم اٹھائے گا تو اس کے قدم قدم پر بھٹکنے کا احتمال ہوگا۔ امام شعرانی کے الفاظ میں "مراحلِ سلوک الفاظ سیکھنے سے طے نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ چلنے کا ہے نہ کہ سیکھنے کا۔"

ذوقِ ایں مے نشناسی، تا نہ چشی

عبودیت

انسان کا مقصدِ تخلیق عبادتِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی ہے: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ یہی شرفِ آدمیت اور معراجِ انسانیت ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان عبد اور معبود کا یہی رشتہ عبودیت کہلاتا ہے۔ جب تک اس رشتہ کا شعور اور احساس قائم رہتا ہے انسان اپنی حقیقت کو نہیں بھولتا اور اس میں بلند پایہ خصائلِ حمیدہ جنم لیتے ہیں لیکن اس احساس کے ختم ہوتے ہی انسان، انسانیت کے مقامِ رفیع سے ہٹ کر حیوانیت کے قعرِ مذلت میں گر جاتا ہے اولئک کالانعام بل ھم اضل، یا احسن التقویم کی بجائے اسفل السافلین کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ انبیائے کرام کا مقصدِ بعثت بنی نوعِ انسان کو اسی نصب العینِ حیات کی طرف دعوت دینا رہا ہے اور صوفیائے کرام کی بھی ہر دور میں یہی کوشش رہی ہے کہ وہ انسان کو اس بھولے ہوئے رشتہ کا احساس دلائیں اور اسے مضبوط و مستحکم کریں:

زندگی آمد برائے بندگی ۔۔۔ بندگی بے بندگی، شرمندگی

چنانچہ عبودیت ہی راہِ تصوف کا پہلا اور آخری مقام ہے۔ فرق یہ ہے کہ آخر میں، یعنی صوفیانہ ریاضتوں اور مجاہدات کے بعد عبودیت یقین و اذعان اور کشف و شہود کی نعمتوں سے سرفراز ہوتی ہے: الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان و تصوف کا منتہائے وجود یہ ہے کہ تو خدا کی عبادت اس طرح کرے، گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ کیفیت میسر نہ ہو تو کم از کم یہ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

عبدِ کامل

عبدیت دراصل ایک مستقل اور ہمہ گیر رشتہ ہے جس کا اثر زندگی کے تمام معاملات پر پڑتا ہے۔ اخلاص وللہیت کی کیفیت مستمرہ، صرف ریاضت و عبادت کے دوران ہی انسان میں نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کا اثر زندگی کے تمام معاملاتِ معاشی و معاشرتی میں محسوس ہوتا ہے۔ امام شعرانی کے الفاظ میں عبودیت عبارت ہے عجز و انکسار، تواضع و تمکسر اور افتقار و احتیاج سے اور عبدِ کامل وہ ہے جس میں وہ تمام صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ عبدِ کامل کا سر تسلیم ہر حال میں آستانۂ الٰہی پر خم رہتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ کا محتاج سمجھتا ہے[۵۴]۔ دنیا و آخرت کے حظوظ و لذات پر دل نہیں لگاتا اور نہ کسی مرتبے اور مقام کا دلدادہ ہوتا ہے۔ دنیوی مراتب اور اخروی اعزازات سے اس کا دامنِ طلب کلیتاً پاک ہوتا ہے۔ وہ محض خدا کا بندۂ محض اور غلام بے دام ہوتا ہے کسی کو بنظرِ حقارت نہیں دیکھتا اور تکبر و ریا وغیرہ اخلاقِ رذیلہ سے کنارہ کش ہوتا ہے۔

بندۂ بے دام

چنانچہ عبدِ کامل کی سب سے بڑی اور پہلی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کا بندۂ محض اور غلام بے دام ہوتا ہے۔ وہ کسی کام پر بھی اپنے آقا سے اجر کا طلب گار نہیں ہوتا۔ بلکہ محض اس کی رضا مندی ہی اور خوشنودی کے لیے کوئی عمل کرتا ہے، نہ کہ ثواب کی امید اور عذاب کے ڈر کے باعث۔ عبدِ کامل اوامرِ الٰہیہ کو بجالاتا ہے اور منہیاتِ شرعیہ سے باز رہتا ہے، صرف اس خیال سے کہ وہ اللہ کے

---

۵۴ اگرچہ عاجزی و انکساری اور فقر و احتیاج ہی حقیقتِ بندگی ہے۔ تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندہ اپنی حد سے کیوں تجاوز کرتا ہے۔ اس کی وجہ امام شعرانی کے نزدیک دراصل یہ ہے کہ انسان اخلاق الٰہی کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔ چونکہ عظمت و کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے۔ انسان بھی اپنے مقام سے غافل ہو کر اسی قسم کے دعووں میں مبتلا ہو جاتا ہے، جن کا حقیقتِ انسانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ الہامی کتابیں اسی لیے نازل ہوئیں اور انبیائے کرام اسی لیے مبعوث ہوئے کہ وہ انسان کو اس کی حقیقت اور صحیح قدر و منزلت سے آگاہ کریں تاکہ وہ خدائے بزرگ و برتر، ذوالجلال والاکرام کے حضور ایک بندۂ عاجز کے طور پر پیش ہو اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔

احکام ہیں اور اپنے آقا کے احکام کی بجا آوری غلام پر فرض ہے۔ ثواب کی امید اور عذاب کے ڈر کا خیال، اخلاص و تسلیم کے منافی ہیں۔ ایسا کرنا دراصل اجرت کی خاطر کرنا ہے۔ لیکن عبدِ کامل کے نزدیک طلبِ اُجرت بے ادبی اور گستاخی ہے۔ عبدِ کامل صرف تعمیلِ ارشاد کی خاطر کوئی کام کرتا ہے، اور اللہ اسے بغیر مانگے سب کچھ دیتا ہے، اگرچہ اس کے اپنے دل میں اللہ کے سوا اور کسی چیز کی احتیاج نہیں ہوتی۔

عبدِ کامل اُجرت چھوڑ کر صرف اپنے آقا کی محبت اور اس کے تقرب کا خواہاں ہوتا ہے۔ آقا بھی جب اپنے بندہ کو محبت و تعظیم سے عبادت و خدمت کرتے دیکھتا ہے تو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی خلعت سے نوازتا ہے اور اس پر اس قسم کے اعزازات و اکرامات کی بارش برساتا ہے جو کبھی اس کے خیال و خواب میں بھی نہ آئے تھے۔ اس کے برعکس، جو بندہ آقا کی خدمت کسی غرض اور نفع کے لیے کرتا ہے تو اسے اس کی اجرت مل تو جاتی ہے مگر خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے کہ ایک خادم محض خلوص نیت اور حسنِ ارادت سے بادشاہ کی خدمت کرتا ہے اور اس سے کچھ مانگتا نہیں تو بادشاہ اسے بلا سوال جاگیریں وغیرہ عطا کر دیتا ہے، مگر جو ملازم محض چند ٹکوں کے لیے خدمت بجا لاتا ہے تو بادشاہ کو اس کی خدمت و ملازمت کچھ زیادہ گوارا نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُسے علیحدہ کر دینے کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ بیش بہا عنایتوں سے مالامال ہو۔

غرض یہ کہ عبدِ کامل آقائے حقیقی کی بندگی و عبادت کسی اجر کے لیے نہیں کرتا بلکہ اس سے محض رضائے الٰہی کا طالب ہوتا ہے۔ اس پر اپنے آقا کی عظمت و جلالت کا کچھ ایسا پرتو چھا جاتا ہے کہ وہ اسی میں حیران اور مستغرق ہو جاتا ہے۔ تا آنکہ حالت یہ ہوتی ہے کہ آنکھیں کشادہ ہونے کے باوجود کچھ نہیں دیکھتا اور کانوں کی سلامتی کے باوجود کچھ نہیں سنتا۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ تمام اعضا و جوارح دل کے تابع ہوتے ہیں۔ جب دل ہی یادِ الٰہی میں مصروف ہو تو اعضا بھی اسی کی روش اختیار کرتے ہیں۔ اور عالمِ محسوسات کو قطعاً محسوس نہیں کرتے۔

راضی برضا

عبدِ کامل کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ ہر حال میں خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ خدا تعالیٰ

کی رضا پر راضی رہتا ہے۔ نیکی یا بدی جو بھی پیش آئے اسے اپنے حق میں بہتر سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا آقا بہ نسبت اس کے، اس کے خیر و شر کو بہتر پہچانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو بندہ اپنے لیے بُری خیال کرے مگر وہی اس کے حق میں بہتر ہو۔ اور ایک چیز کو وہ اپنے لیے بہتر سمجھے، مگر وہی اس کے لیے بدتر ہو:۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیرٌ لکم و عسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شرٌ لکم۔

عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو (اپنے لیے) ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے اچھی ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔

دعویٰ ملکیت سے گریز

عبدِ کامل کا ظاہر و باطن میں کسی کو سوائے خدا کے کسی چیز کا مالک نہیں گردانتا۔ یہی وجہ ہے کہ عارف کسی چیز پہ اپنا حقِ ملکیت نہیں سمجھتا۔ اہلِ حق عارفوں کے نزدیک دعویٰ ملکیت عبودیت سے خارج ہے۔ اسی اعتقاد کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جان و مال کو بھی اسی کا سمجھتا ہے اور اس کی خاطر مر مٹنے سے بھی گریز نہیں کرتا، کیونکہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گویا عبدِ کامل کے نزدیک تمام اشیا و موجودات خدا کی ملکیت ہوتی ہیں۔ وہ بندوں کو مجازی مالک تصور کرتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ ان کا مالک ہونا بھی خدا تعالیٰ کے فضل و احسان کا کرشمہ ہے اور دنیا کے نظم و نسق اور امن و امان کا ذریعہ۔ ورنہ باعتبار حقیقت کے تو وہی مالک ہے۔

صبر و شکر

عبدِ کامل کی چوتھی نشانی یہ ہے کہ جب اسے کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو اس خیال سے کہ ظاہر میں یہ نعمت ہے، اس کا شکر بجالاتا ہے اور اس خیال سے کہ کہیں یہ ابتلا کا موجب نہ ہو، خوف کھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نعمت کو وسیلۂ محنت بھی جانتا ہے اور نعمت کے ملنے پر مغرور نہیں ہوتا۔ لوگ اگر اس کی تعظیم بجالائیں تو اس کے دل میں تکبر و سرکشی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ اسے ایک ابتلا جان کر لوگوں کو ایسا کرنے سے روکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں تکلیف بہ نسبت آرام کے زیادہ ہے۔ کوئی نعمت و راحت ایسی نہیں

جو تکلیف و بلا سے خالی ہو۔ یہ دنیا دار المحن ہے۔ یہاں نعمت کے ساتھ نقمت، فائدہ کے ساتھ نقصان اور راحت کے ساتھ رنج برابر ملتے ہیں۔ اسی لیے دانش مندی اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مصیبتوں پر صبر کیا جائے۔ کسی کے سامنے لب شکوہ وا نہ کیا جائے اور ہر قسم کی تکلیف کو حوصلہ اور دلیری کے ساتھ برداشت کیا جائے۔

تبدیل و تحویل اور محو و اثبات کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر ایک چیز ایک حالت میں ذریعہ راحت و نجات اور دوسرے لمحے باعث موت و ہلاکت ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک کشتی دریا میں اترتی ہے۔ سب لوگ رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ مگر خدا نخواستہ وہ کشتی چند لمحے بعد دریا میں ڈگمگانے لگتی ہے تو ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ یعنی وہی چیز جو کچھ دیر پہلے باعثِ نجات تھی، اب وہی ذریعۂ ہلاکت معلوم ہونے لگتی ہے۔ آیت کا آخری حصہ قابلِ غور ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

امام شعرانی کہتے ہیں کہ صبر و شکر کی یہ کیفیت خاصانِ خدا کا خاصہ ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ معارفِ قرآنی صحیح طور پر اس کے سینہ میں اتر آتے ہیں جو انوارِ الٰہی کا گنجینہ، اور فیوضاتِ ربانی کا خزینہ ہو۔

عبادت میں خشوع و خضوع

عبدِ کامل کی پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ جتنی بھی عبادت کرے اور جس قدر ممکن ہو خضوع و خشوع ظاہر کرے، لیکن پھر بھی گمان کرتا ہے کہ عبادتِ حق کا صحیح حق ادا نہیں ہوا کہ محض خدا کا فضل و کرم ہی اس کی نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے نہ کہ اس کی عبادت و ریاضت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت و ریاضت میں ہمہ شب مصروف رہتے تھے۔ اس حد تک کہ آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا لیکن پھر آپ بندگی و عبودیت کا حق ادا کرنے سے عاجزی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ما عبدناك حق عبادتك کہ اللہ العالمین ہم عاجز بندے تیری عبادت کا حق ادا نہ کر سکے۔

چنانچہ عبدِ کامل صرف فرائض کی ادائیگی پر ہی قناعت نہیں کرتا بلکہ نوافل سے ذاتِ باری کا تقرب چاہتا ہے۔ بمصداق حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام: لا یزال عبدی یتقرب

الیّ بالنوافل حتی احبہ - میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب ڈھونڈتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں - یہی وجہ ہے کہ عبدِ کامل کے نزدیک تطوع کا درجہ فرض سے بڑھ کر ہے - یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنی چاہیے کہ ایک کام آقا کی طرف سے بندے پر واجب ہے - مثلاً اس کے کھانے کے لیے کھانا پکائے - اب اگر وہ صرف اسی پہ اکتفا کرتا ہے اور آقا کی مزید خدمت و تواضع نہیں کرتا تو وہ خود غرض اور مفاد پرست سمجھا جائے گا - جسے حوادثِ روزگار نے اس مقام پر مجبور کر دیا ہے - ایسی صورت میں اسے اپنے مالک کی خوشنودی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے - برعکس اس خادم کے جو اپنے فرض کے علاوہ بھی اپنی رضا کارانہ خدمات اپنے آقا کے لیے وقف کر دیتا ہے - بالکل اسی طرح جو محض فرائض کو کافی سمجھتے ہیں وہ عبودیت کی لذت اور حقیقت سے ناشناسِ محض ہیں - تقرب و شرافت تطوع و نوافل سے ہی حاصل ہوتے ہیں نہ کہ محض فرائض کے ادا کرنے سے -

خوفِ خداوندی

جس قدر عبدِ کامل اور عارفِ صادق اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس سے خوف کھاتا ہے - یہ ایک وسوسہ ہے کہ مقربین جب خدا کے چہیتے ہو جاتے ہیں تو ان سے تکالیف شرعی اٹھ جاتی ہیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے : انا اعرفکم باللہ واخوفکم (میں تم سے زیادہ عارف ہوں اور بہ نسبت تمہارے خدا سے زیادہ ڈرتا ہوں) یہ نکتہ ہمیشہ یاد رہنا چاہیے کہ احکامِ الٰہی کی تعظیم و متابعت سے خدائے قدوس کی محبت بڑھتی ہے اور تقرب حاصل ہوتا ہے اور جتنا تقرب حاصل ہوتا ہے اسی مناسبت سے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے - مبادا کوئی لغزش اس نعمت سے محروم کر دے - اس لیے عبدِ کامل تقرب کے ساتھ ہیبت و جلالِ الٰہیہ میں زیادہ غرق ہو جاتا ہے اور اس کی جبینِ نیاز ہمیشہ احکامِ الٰہی کے آستانۂ ناز پہ جھکی رہتی ہے -

(باقی آئندہ)